وِلنگٹن:

ہاں یہ اُسی مشہور انگریز جنرل لارڈ **وِلنگٹن** کے نام سے موسوم کیا گیا شہر ہے جس نے فرانسیسی جنرل نپولین بوناپارٹ کو ''واٹرلو'' کے مقام پر شکست سے دوچار کر کے اُسکی بڑھتی ہوئی فتوحات کے رَیلے کو یکدم روک دیا تھا۔ ''راٹا رووا'' سے واپسی پر ہم نے نیوزی لینڈ کے اِس صدر مقام کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی لہٰذا ہمارا واپسی کا سَفر **وِلنگٹن** کے راستے ترتیب دیا گیا۔ جیف بینٹ نے اپنے ہیڈ کوارٹر میں موجود رفقائے کار کی مدد سے ہمارے استقبال اور قیام کو ممکن بنایا۔ یہ شہر آبنائے کُک کے کنارے واقع 1865ء سے مُلک کے دارالحکومت کے طور پر کام کر رہا ہے۔ شروع میں یہ شرف شمالی شہر ''آک لینڈ'' کو حاصل رہا لیکن جنوبی جزیرہ کے احساسِ محرومی کو کم کرنے کی خاطر بعد میں مُلک کے تقریباً درمیان میں واقع اِس بستی کا اِنتخاب کیا گیا۔

مشہور مُہم جُو کیپٹن کُک نے جنوبی سمندروں میں نئے جزائر دریافت کرنے کی جستجو میں اِس علاقے کو شاہ اِنگلستان کی قلمرو میں شامل کرنے کی راہ نکالی۔ **وِلنگٹن** میں واقع پوسٹل ہیڈ کوارٹر پہنچے تو ہمارے سامنے ہمارے محدود وَقت کے حوالے سے ہمیں مصروف رکھنے کی خاطر اِس عمارت کی دَسویں منزل پر حکومت کینیڈا کے تعاون سے قائم کردہ جدید ترین سارٹنگ سنٹر کو دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ لیکن ہم نے شہر کے اہم تاریخی مقامات اور بازاروں کی رونقوں کا جائزہ لینے کو ترجیح دی تا کہ راٹا رووا میں گذارے ہوئے دس مصروف دِنوں کے بعد اپنے قوائے مضمحل کو مزید ذہنی بوجھ اُٹھانے سے بچایا جا سکے۔ لہٰذا اِس جمہوری مُلک کی جمہوریت کی پاسبان پارلیمان کی عِمارت کو دیکھا جو تاجِ برطانیہ کے مقرر کردہ گورنر جنرل کی تقرّری کی توثیق کرتی ہے اور عوامی اُمنگوں کے مطابق قوانین وضع کرتی ہے۔ شہر کی رونقیں آبنائے کُک کے کنارے پھیلی ہوئی آبادی کی مرہونِ منت ہیں۔ ہماری رہنما خاتون ہمیں ایک انتہائی خوبصورت پارک بھی دکھانے لے گئیں جہاں ہماری مُلاقات اچانک ہماری کانگریس کی تھائی وفد کی خواتین اراکین سے ہوگئی۔ ہماری خوشی سے کچھ زیادہ خوشی کا اِظہار دوسری جانب سے ہوا جنھوں نے ہمیں اِس خوبصورت پارک کے منظر نامے کی مناسبت سے اپنے ساتھ تصاویر بنانے کے لیے کہا۔ ہم نے اُن سے **وِلنگٹن** تشریف لانے کی وجہ دریافت کی تو فرمانے لگیں کہ وہ اپنے ایک باہمی دوست کی دعوت پر اُن سے ملنے جنوبی جزیرہ کے اہم شہر کرائسٹ چرچ جانے کا اِرادہ رکھتی ہیں اور وہاں جانے کے لیے اِس شہر سے ہو کر گذرنا پڑا۔

یوں تو ہمارے ہم وطن دُنیا کے ہر خِطۂ زمین پر نظر آجاتے ہیں اور دولتِ مشترکہ سے وابستہ ممالک میں تو بکثرت پاکستانی آباد ہیں۔لیکن جنوبِ بعید کے اس انگریزی خواں مُلک میں ہماری مُلاقات جب اعجاز حیدر صاحب کے علاوہ کسی پاکستانی سے نہ ہوئی تو ہم خاصے پریشان ہوئے۔اعجاز صاحب تو ہماری عالمی تنظیمِ ڈاک کے نمائندے کی حیثیت سے یہاں موجود تھے۔اور اکثر اپنے بزرگوارانہ مشوروں اور مخصوص لاہوری چٹکلوں سے نوازتے رہتے تھے۔ ہمارے قیام کے آخری دن علی الصباح ہمارے کمرے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کی گھنٹی بجی تو قدرے عجیب سا لگا۔فون اُٹھایا تو کسی صاحب نے ''السلام علیکم'' کہا اور اُردو میں اپنا تعارف کرانے لگے۔لہٰذا ہمیں احساس ہوا کہ اعجاز حیدر کے علاوہ اِس مُلک میں کوئی اور بھی اُردو بول لیتا ہے۔ہم نے پوچھا ''حضرت آپ یہاں کیسے پہنچے؟''تو قیر خان فرمانے لگے۔"میں آسٹریلیا کے شہر سِڈنی میں پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کا سٹیشن منیجر تھا کہ میرا تبادلہ واپس کراچی کر دیا گیا۔میں واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔اِدھر نیوزی لینڈ پوسٹ نے نئی بھرتی کیلئے اشتہار دیا تو میں نے درخواست دے دی اور خیر سے اُنہوں نے اپنے بازوؤں میں ہمیں جائے پناہ دے دی''۔''پھر تو آپ کے دِل کی بات ہوئی''۔ہم نے گِرہ لگائی اور پوچھا''اور بھی کوئی پاکستانی یہاں آباد ہے؟''۔ ''ہم کُل ایک سو گیارہ ہیں۔اکثریت بحری جہازوں پر کام کرنے والوں کی ہے۔ہم نے اپنی ایک پاکستان انجمن بنا رکھی ہے اور ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوتے ہیں''۔سچ ہے دیارِ غیر میں ایسی یگانگت کا مظاہرہ ناگزیر ہے۔

وِلنگٹن کے مرکزِ شہر سے ہوئی اڈے پر پہنچنے کے لیے ہمیں ساحلِ سمندر پر ایک لمبی بَل کھاتی سڑک پر ایک انتہائی خوبصورت ڈرائیو مِلی۔ایک انتہائی آرام دِہ گاڑی میں نیوزی لینڈ پوسٹ کی ایک انتہائی جاذبِ نظر خاتون افسر کی رفاقت اور اُن کی عالمانہ گفتگو نے تو ہمارے سفر کو واقعی یادگار بنا دیا۔یہ دوشیزہ بتا رہی تھیں کہ اُنہوں نے وِلنگٹن یونیورسٹی سے ہی اکنامکس میں ماسٹرز کیا ہے اور اُنکی کمپنی علیٰحدہ سے مرد ڈرائیورز رکھنے کی متحمل نہیں۔اِس لیے کمپنی کا ہر منیجر ہر ایسے ویسے کام کے لیے تیار ہوتا ہے۔خدا گواہ ہے ایسی خوبصورت رفاقت کو کون ظالم چھوڑنے پر تیار تھا لیکن شاعرِ مشرق کا یہ اِرشاد یاد آنے لگا۔

تو رَہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلےٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

جہاز میں بیٹھے تو ایک دفعہ پھر جنوبی نصفِ کُرّے کے آخری حدود سے شمالی نصف کُرّے میں واقع اپنے

پَس ماندہ وطن کی طرف کم از کم بیس گھنٹے کا طویل ہوائی سفر درپیش تھا۔ آخر انگریز نے ہمارے دیس پر بھی حکومت کی اور جنوبِ بعید کی اِس دھرتی پر بھی لیکن مادی خوشحالی کے خواب صرِف یہاں کیسے پورے ہوئے؟۔ جہاز بحرالکاہل اور بحرِ ہند میں واقع لاتعداد جزائر اور ممالک پر سے پرواز کرتا ہوا ہمیں اپنے وطن کے قریب لا رہا تھا۔ اور ہم راٹا رووا کے گندھک کے چشموں۔ سینکڑوں ہزاروں میٹر گہرے غاروں۔ گھنے جنگلوں۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے مخصوص نباتات وحیوانات اور ''ماپو'' جیسی بے پایاں خوبصورت ماحول والی جھیلوں میں کشتی رانی کی یادوں اور نہ جانے کتنے موریوں جیسی ناپید ہونے والی قوموں کے تصور کو اپنے ذِہن سے محو کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

دُنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر۔ (نیپال):

دُنیا کی بُلند ترین چوٹی اُنتیس ہزار فٹ سطحِ سمندر سے اُونچی۔ ماؤنٹ ایورسٹ ایک ایسے مُلک میں واقع ہے جہاں ماحولیاتی آلودگیوں سے مُبّرا بے شمار تازہ پانی کی جھیلیں۔ درجن بھر سے زائد دریا اور لاتعداد سرسبز وشاداب وادیاں موجود ہیں۔ مملکت کے کُل ایک لاکھ سینتالیس ہزار مربع کلومیٹر رقبے کا 45 فیصد حِصّہ جنگلات پر مشتمل ہے جہاں شیر، چیتے، جنگلی بھینسیں، برفانی ریچھ، بھونکتے ہرن، رینوز اور خُدا جانے کِن کِن وحشی درندوں کے ساتھ ساتھ سُرخ پانڈے اور نیلی بھیڑیں بھی دندناتی پھرتی ہیں۔ جہاں دُنیا کی چودہ عدد خوبصورت تتلیوں کے خاندانوں میں سے گیارہ عدد تو محض یہاں پائی جاتی ہیں۔ اور کوئی چھ سو کے لگ بھگ مقامی طور پر اُگنے والے پودوں کے خاندان موجود ہیں۔ جہاں ماؤنٹ ایورسٹ (8,848 میٹر بُلند) کے علاوہ کئی ایک دیگر بُلند چوٹیاں مثلاً دُنیا کی تیسری بُلند ترین چوٹی کنچن چنگا، لوئیت، مَکالو، چُو یو، دوال گیری، مناسلو، آنّا پورنا، گوریشنکر اور ماچھا پوچرے نامی سب ہی چوٹیاں آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ بُلند ہیں۔ یہی نہیں دُنیا کی گہری ترین وادی ''آرن'' اور سب سے زیادہ گہری گھاٹی ''کالی گنڈا کی'' بھی تو یہیں واقع ہے۔ [1]

پھر کروڑوں پرستاروں کا روحانی پیشوا اور دُنیا کے عظیم ترین مذاہب میں سے ایک یعنی بُدھ مت کے پیشوا مہاتما بُدھ اِن ہی وادیوں میں اپنے دائمی پیغامِ امن ومحبت کے ساتھ یہیں کے ایک مقام ''لومبینی'' میں پیدا ہوئے۔ یہ مقام آج بھی لاکھوں زائرین کو ہر سال اپنی طرف کھینچ کر لاتا ہے۔ ہندومت کی رُو سے نِسوانی خصوصیات کی آئڈیل خاتون ''سیتا'' کا جنم بھومی بھی یہی مُلک تھا۔ آج یہاں کے باشندوں میں سے 86.5

---

[1] بحوالہ وِکی پیڈیا ڈاٹ کام

فیصد کا تعلق ہندومت سے۔ جبکہ 7.8 فیصد بُدھ مت سے اور کوئی 3.5 فیصد کا تعلق دینِ اِسلام سے ہے۔

لیکن اِس مُلک کی حیرت انگیز بائیوڈائیورسٹی اور بے شمار پیروکارانِ اَدیان سے قطع نظر اِس کا دارالخلافہ ''کھٹمنڈو'' جس کے لفظی معنی ''مندروں کا شہر'' بتائے جاتے ہیں' دُنیا کا ایک ایسا خطۂ زمین ہے جہاں کے محض تین سو مربع کِلومیٹر کے اندر ہی اندر اقوامِ متحدہ کے اِدارے ''یونیسکو'' کی جانب سے سات عدد مقامات کو عالمی سطح پر ''میراثِ انسانیت'' قرار دیا گیا ہے۔ یہ دُنیا بھر میں واحد ایسا شہر تسلیم کیا جاتا ہے جسے یہ اعزاز حاصل ہے۔ یہاں کی تین آبادیوں کٹھمنڈو' پٹّن اور بھکت پور کے مراکزِ دربار اور پُشپانی ناتھ۔ چانگونرائن اور بہود ناتھ کے مندر اِس فہرست میں شامل ہیں۔ آج بھی اِن تین قدیم شہروں کے باسیوں کو اپنے ذاتی گھر مسمار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ صرف اِن کی مُرمت اور زیب و آرائش ہی کر سکتے ہیں تا کہ اِن کی اَصل ساخت میں کوئی تبدیلی آنے نہ پائے۔ اِن سب عجوبۂ روزگار حقائق کی یہاں موجودگی کے باعث نیپال کو دُنیا کا سب سے بڑا میوزیم قرار دیا جاتا ہے۔

جون 1991ء میں جب سارک تنظیم کی نامہ بری کے شُعبے سے متعلق قائم کردہ تکنیکی کمیٹی کے اِجلاس میں شرکت کے سلسلے میں ہماری سربراہی میں پاکستانی وفد کٹھمنڈو کے ہوائی اڈے پر اُترا تو ہر سُو رنگ برنگی نیپالی ٹوپیاں پہنے ہوئے اَفراد کو دیکھ کر یوں لگا گویا جہاز سے اُترنے والے ہم سب مُسافر یہاں کی کسی عالمی شہرت یافتہ پہاڑی چوٹی کو سر کرنے کا عزم لئے وارد ہوئے ہیں۔ اِس احساس کو تقویت کچھ یوں بھی مِلی کہ ہماری پرواز کے بیشتر مسافر مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے مرد و زن سیّاح تھے اور اغلباً بُلند پہاڑوں کو اپنے قدموں تلے روندنے کا عزم لئے ہوئے تھے۔

ہمارے میزبان ہمیں ہوائی اڈے سے سیدھا ہماری قیام گاہ ہوٹل ''ہمالیہ'' لے گئے۔ اپنا مختصر سا سامان اپنے اپنے کمروں میں رکھنے کے بعد جب ہم تازہ ہوا لینے کے اِرادے سے ہوٹل کے سرسبز لان میں آئے تو مقابلتاً صاف موسم کی بدولت اپنی آنکھوں کے سامنے سربسر برف پوش پہاڑوں میں سے ماؤنٹ ایورسٹ کو کسی دیوہیکل اونٹ کے کوہان کی مانند سلسلۂ کوہ میں واضح دیکھا۔ ہمارے دوست ارشد ملک نے جھٹ سے اِسی پس منظر میں ہماری تصویر اُتاری اور پھر ہمارے ہاتھ میں اپنا کیمرہ تھماتے ہوئے اپنی تصویر بنانے کی فرمائش کر دی۔ ''اِتنی جلدی بھی کیا ہے۔ پورا ہفتہ یہاں رہنا ہے''۔ ہمارے مُنہ سے نِکلا۔ فرمانے لگے ''آپ نے سُنا نہیں۔ یہ منظر روزانہ دیکھنے کو نہیں ملتا''۔ اور بات کچھ یوں ہی تو تھی۔ اُس روز کے بعد سے آسمان پر گہرے سیاہ بادلوں نے ماؤنٹ ایورسٹ کی طلسماتی چوٹی کو ہم سب کی نگاہوں سے اوجھل رکھا۔

اگلی صبح ہم نیپالی وزارت خارجہ کی عمارت کے قریب واقع سارک تنظیم کے صدر دفتر کے لئے روانہ ہوئے تو شاہی محلات کو جانے والی شاہی شاہراہ پر ایک خوبصورت مسجد کے مینار نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ یہ ''پنج کشمیری جامعہ مسجد'' ہے جو دوسری تمام مذہبی عبادت گاہوں کی بہ نسبت شاہی محل کے قریب تر واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ کوئی پانچ سو برس پہلے کی بات ہے کہ یہاں کے راجہ کے دربار پر بدروحوں نے بسیرا ڈال دیا۔ راجہ نے ہر کس و ناکس کو مدد کے لیے پکارا لیکن کوئی اِس سلسلے میں اُس کی مدد نہ کر سکا۔ آخر راجہ نے وادیٔ کشمیر کے ایک مسلمان بُزرگ شاہ مسکین شاہ اَندرابی کو اپنے ہاں دعوت دی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ حضرت شاہ مسکین اور اُنکے بھتیجے سید غیاث الدین شاہ کی دُعاؤں سے بدروحوں سے شاہی دربار کو نجات ملی۔ یوں شاہ صاحب کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا تو راجہ نے اُن سے کٹھمنڈو میں مُستقِل طور پر رہائش پذیر ہونے کی درخواست کر دی اور اپنے لئے مسجد اور خانقاہ کی تعمیر کے واسطے از خود جگہ منتخب کرنے کو کہا۔ شاہ صاحب نے اپنے مُصّلے کو ایک جگہ رکھا تو وہ آگے کی طرف پھیلنے لگا اور ایک جگہ پہنچ کر پھر واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ یوں اُسی لحاظ سے مسجد و خانقاہ کے لیے جگہ دے دی گئی۔ دونوں حضرات کی زیارتیں اِسی احاطے میں آج بھی موجود ہیں اور مسجد میں 8,800 افراد بآسانی نماز ادا کر سکتے ہیں۔

اُس وقت کے سارک تنظیم کے معتمِد عمومی نے ہمارے اِجلاس کا اِفتتاح فرمایا۔ تقریب میں نیپالی حکومت کے زُعماء نے بھی شرکت کی اور پھر ایک استقبالیہ دعوت کے بعد سارے مندوبین رَسمی بیٹھک میں شرکت کے لیے ''ہوٹل ہمالیہ'' کے لیے روانہ ہو گئے۔

اپنے ایجنڈے پر بحث مباحثے اور دیگر سرکاری تقریبات میں شِرکت کے ساتھ ساتھ ہم کٹھمنڈو اور اِس کے مُضافات کی سیر و تفریح سے بھی محظوظ ہوتے رہے۔ یہاں کے قدیم و جدید شاہی محلات۔ بُدھ پگوڈوں اور ہندو مت کے بیشمار مندروں کو دیکھنے کے علاوہ ہم نے یہاں کے مقامی صنعت کاروں اور ماہر کاریگروں کے ہاتھوں سے بنی ہوئے اشیاء کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ اُردو زبان سے یہاں کی آبادی خاصی مانوس نظر آئی۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہندوستان میں مُغلیہ دور میں جب راجپوتانہ سے آنے والے جنگجوؤں نے آ کر کٹھمنڈو کے مشرق میں واقع گورگا علاقے پر قبضہ کیا۔ اُس وقت سے اُردو عدالتی زبان کے طور پر مستعمل رہی۔ یہ اور بات ہے کہ اُس دور میں مسلمانوں، بدھوں اور عیسائی آبادی کو نیپال سے بڑی تعداد میں مُلک چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا اور ہندو حکمرانوں کی سرپرستی میں بُدھوں کے وسیع اور انمول کتابوں کے ذخیرے کو مُکمل طور پر خاکستر کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں۔

ملک ارشد اور ہم پاکستانی سفارت خانے گئے تو وہاں نہ تو سفیر صاحب کو موجود پایا اور نہ ہی دیگر اعلیٰ سفارت کاروں کو جو سب کے سب رُخصت پر پاکستان جا چکے تھے۔ صرف ایک عدد سیکرٹری صاحب جو ہمارے شمال مغربی سرحدی علاقے کے وزیر قبائل سے تعلق رکھتے تھے سب حضرات کی قائم مقامی فرما رہے تھے۔ "معلوم ہوتا ہے۔ ہماری سرکار نے اِس پہاڑی دارالحکومت کو بھی اپنا قبائلی علاقہ سمجھ رکھا ہے" ہم نے دِل ہی دِل میں کہا۔ ویسے ہمارے شور مچانے پر بھی تو کسی کے کان پر جُوں رینگنے کے امکانات بہت کم تھے۔ لہٰذا اِس تکلیف میں پڑے بغیر موجود سفارت کار سے ایک پیالی چائے نوش جان فرمانے کے بعد ہم نے اُن کے حق میں دُعا کرتے ہوئے سفارتِ پاکستان کو خیر باد کہا۔ اور اگلی صبح پاکستان کی قومی ہوا پیما کے ذریعے نیپال سے ہی رُخصت ہو گئے۔

کٹا ہوا بازو:

جولائی 1970ء میں جب ہم نے اُس وقت کے مشرقی پاکستان کا سفر کیا تو ہمارے وَہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ سال ڈیڑھ سال بعد مملکت خداداد پاکستان کا یہ بازو نہ صرف جغرافیائی اور سیاسی طور پر ہم سے کٹ جائیگا بلکہ دونوں حصّوں کی آبادی غیر مُلکی تسلط سے نجات کے لیے کی ہوئی ایک طویل مشترکہ جدوجہد کے باوجود جُدا جُدا اقومی وحدتوں میں بٹ جائیگی۔ نیپال سے واپسی پر ہم نے پاکستان اِنٹرنیشنل ایرلائنز کی اُس پرواز کا اِنتخاب کیا جو براستہ ڈھاکہ (بنگلہ دیش) کراچی (پاکستان) پہنچ رہی تھی۔ کٹھمنڈو کی میٹنگ میں بنگلہ دیش کے وفد کے ارکان ہمارے اور ملک ارشد کے سابقہ رفیقِ کار رہ چُکے تھے۔ ارشد کے دوست رفیق الاسلام تو خاصے دلچسپ آدمی تھے جبکہ ہمارے سابقہ رفیقِ کار اے۔ بی۔ ایم صِدیق اُن دنوں بنگلہ دیش پوسٹ آفس کے سربراہ کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ دونوں نے بڑی گرم جوشی سے ہماری خواہش کا خیر مقدم کیا اور بنگلہ دیش میں ہمارے قیام کے سلسلے میں ضروری اِقدامات کرنے کے لیے ڈھاکہ اطلاع کر دی۔

ہمیں ڈھاکہ دیکھے ہوئے پورے اکیس برس ہو چکے تھے۔ ڈھاکہ بہت کچھ بدل چُکا تھا۔ پلٹن میدان ایک خوبصورت سٹیڈیم کا روپ دھار چُکا تھا جس کے اِردگرد الیکٹرانک اور دیگر مُلکی اور غیر مُلکی مصنوعات کی بے شمار دُکانیں اشیائے صرف سے بھری ہوئی نئی مملکت کی اِقتصادی خوشحالی کا بزبانِ حال پیغام دے رہیں تھیں۔ بنگلہ دیش کئی ایک خون ریز ہنگاموں سے ہو کر گُزر چُکا تھا۔ اب وہاں بیگم ضیاء الرحمان کی بنگلہ دیش نیشنل پارٹی کی حکومت تھی۔ ایک روز وزیرِ اعظم سیکرٹیریٹ کے پاس سے گذرتے ہوئے ہمارے رہنما نے ہمیں بتایا کہ یہاں بنگلہ دیش کی کابینہ کا ہر روز دِن کے بارہ بجے سے اِجلاس شروع ہوتا ہے جس میں اِقتصادی ومعاشی ترقی کا روزمرہ کی بُنیاد پر جائزہ لیا جاتا ہے اور اِس میں دارالحکومت میں موجود سب وزراء لازماً شریک ہوتے ہیں۔ ویسے اب کی بار ہم نے چوراہوں پر بھکاریوں کی تعداد خاصی کم

دیکھی۔شاید روزگار کے مواقع وسیع تر ہو گئے تھے۔بنگلہ دیش کی گھریلو صنعتوں کی بھرپور حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔خاص طور پر گھریلو خواتین چھوٹی چھوٹی صنعتیں لگانے پر بڑی توجہ دی رہیں تھیں۔یہ سب کچھ ''گرامین بینک'' کی کرشمہ سازی سے ہو رہا تھا۔بنگلہ دیش کے ماہر اقتصادیات یونس صاحب کے ذہنِ رسا کا یہ کرشمہ بعد ازاں عالمی شہرت حاصل کر گیا۔باہمی تعاون سے چلنے والی اِس قسم کی بینکاری میں چھوٹے چھوٹے قرضے محض گاؤں اور محلّے کے مقامی باشندوں کی شہادت اور تصدیق پر دئے جاتے تھے۔اِس نظام کی کامیابی اِن چھوٹے چھوٹے قرضوں کی بروقت واپسی کی مرہونِ منت تھی۔

فیلڈ مارشل ایوب خان کے دورِ صدارت ہی میں ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دوسرے دارالحکومت کا سنگِ بُنیاد رکھ دیا گیا تھا۔اُس وقت کی حکومت کے فیصلے کے مطابق اِنتظامی شعبے کا صدر مقام اِسلام آباد (مغربی پاکستان) میں جبکہ پارلیمنٹ (مقننہ) کا مرکز ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں قائم ہونا تھا۔پارلیمنٹ کی یہ عالیشان عمارت ابھی زیرِ تعمیر ہی تھی کہ مُلک دو حصّوں میں بٹ گیا۔بہرحال بیس برس بعد ہم نے عوام کی آرزوؤں اور منتخب نمائندوں کے یکجا ہو کر عوامی فیصلے کرنے کے اِس مقام کو پورے کروفر سے ڈھاکہ کی دھرتی پر ایستادہ دیکھا۔

ہمارے میزبانوں نے ہمیں شہدائے آزادی کی یادگار بھی دِکھائی۔اِن شہیدوں کا خونِ ناحق مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والی فوج کے ذِمہ گردانا جاتا تھا۔اِن دونوں مقامات کو ہم بے بس مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے مُسافر بڑے دُکھ اور رنج کے جذبات سے دیکھتے رہے۔لیکن اِس رُوح فرسا منظر سے بھی زیادہ دِل ورُوح پر گراں بار سِین احمد نگر اور اِس جیسی دوسری بستیوں کا تھا جہاں خود کو پاکستانی کہنے والے لاکھوں سابقہ بہاری باشندے محبوس تھے۔

ہم نے آزادی کے بعد بنگلہ دیش پوسٹ کی تاریخ اور ترقی کی داستان ڈھاکہ جنرل پوسٹ آفس کی چوتھی منزل پر واقع پوسٹل میوزیم کے اَنمول شہ پاروں کی صورت میں دیکھی۔یہ وہی جنرل پوسٹ آفس تھا جسکی موجودہ عمارت کا اِفتتاح 1960 میں اُس وقت کے متحدہ پاکستان کے صدرِ جمہوریہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے اپنے ''مبارک'' ہاتھوں سے انجام فرمایا تھا۔آج وہ نام عوام کی نظر میں ایک گالی سے کم نہ تھا۔

ڈھاکہ میں ہمارے قیام کی آخری شام پوسٹل آفیسرز کی جانب سے ہمارے اعزاز میں ڈھاکہ کلب میں ایک پُر تکلف دعوت دی گئی جہاں سابقہ مغربی پاکستان میں قیام کے متعلق اچھی یادوں کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔لیکن ہمیں معلوم تھا کہ ہمارے اِن سابق رفقائے کار کے دِلوں پر بنگلہ دیش کے اعلانِ آزادی کے بعد مغربی پاکستان کے مختلف شہروں میں کیا گذری تھی بہرحال ہم نے اُن کے حوصلوں کی داد دِی اور اس بات پر خوشی کا اِظہار کیا کہ اُس لمحے بنگلہ دیش پوسٹ کے جُملہ اعلیٰ اہل

کاروں کا تعلق پاکستان پوسٹل سروس سے تھا۔

کاروبارِ نامہ بری:

قرنوں سے سب نامہ بَر اپنے اِدارے کے اصولِ عمل ''خدمت، امانت، دیانت'' کو اپنے لیے وتیرۂ اِمتیاز سمجھتے تھے لیکن کاروبارِ زندگی کے دِن پھرے تو اِس مَلکوتی پیشے کو بھی نفع ونقصان کے ترازو میں تولا جانے لگا۔ عالمی بینک نے پوسٹل سروسز کو حکومتی محکمہ کے طور پر کام کرنے کی بجائے ایک جدید کارپوریشن میں بدلنے کا مشورہ دیا۔ سرمایہ دار مُلکوں نے پہل کی تو عالمی تنظیم ڈاک نے بھی اِسی طرزِ عمل کی سفارش کردی۔ 1991ء میں وزیرِاعظم محمد نواز شریف صاحب کی حکومت نے وزارت مواصلات ہی میں شامل اِدارے ٹیلی فون وتار کو کارپوریشن میں بدل دیا تو محکمہ ڈاک کو بھی شہ ملی۔ افسرانِ ڈاک اور وزارتِ مواصلات کے کارپردازوں نے باہم مشاورت سے ایک صدی سے زیادہ عرصے پر مُحیط طریقہ کار کو خیرباد کہنے کی ٹھان لی۔ ہمارے ایک رفیقِ کار شیخ نصیرالدین (مرحوم) جو لاہور میں پوسٹل بیمہ زندگی کے جنرل منیجر تھے، نے وہیں کی ایک لاء فرم حسن اینڈ حسن سے نئی قانون سازی کے لیے اولین مسوّدہ بنوایا۔ اور ہیڈ کوارٹر پر موجود ہم خادمین نے اِس کی نوک پلک سنوارنے میں اپنا اپنا رول ادا کیا۔ ہمارے ایک ذہین بھائی ضیاءالرحمٰن ذبیح کا اِس سلسلے میں کردار نہایت نمایاں رہا جو اُس وقت اِتفاق سے وزارتِ مواصلات میں جائنٹ سیکریٹری کے عُہدے پر فائز تھے۔

وزیرِ مواصلات محمد اعظم خان ہوتی اور سیکرٹری مواصلات سلمان فاروقی صاحب نے حوصلہ افزائی اور خصوصی سرپرستی فرمائی۔ پوسٹل سروسز کارپوریشن کا قانون پاس ہوا تو سلمان فاروقی صاحب اِس کے اولین چیئرمین بنے اور کوئی تین ماہ بعد یہ عُہدہ جلیلہ پوسٹل سروسز کے امیر نواز خان مرحوم کے لیے چھوڑ گئے۔ اِتفاق سے بدلتی رُت کا پہلا شِکار شیخ نصیرالدین ہی بنے جن کو اِدارے کے بورڈ پر جگہ نہ مِل سکی۔ یہی انجام کئی دیگر آزمودہ کار صاحبان کا ہوا۔ ظاہر ہے ہمارے اِن سب قابلِ قدر ساتھیوں کا موڈ خراب ہونا ہی تھا۔ لہٰذا اُنہوں نے مِل کر عدالتِ عالیہ کے اونچے دروازوں پر دَستک دِی۔ ماتحتِ عملے کا موڈ بگاڑنے کے لیے تو یہی کافی تھا کہ نئے آرڈیننس کے مطابق اَفسران تو سرکاری ملازم بھی رہے اور کارپوریشن کے عُہدوں پر مُتمکن رہے لیکن نچلا عملہ محض کارپوریشن کی مُلازِمت برقرار رکھ سکا۔ لہٰذا سرکار کی نوکری والی مُفت کی کئی سہولیات سے محروم ہوگیا۔

کارپوریشن کے بورڈ پر ہمارے سمیت پانچ پوسٹل افسران ڈائریکٹر متمکن کردیئے گئے اور ساتھ ہی وفاقی حکومت کے تین سیکرٹری (وزارتِ مواصلات، وزارتِ خزانہ اور پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ کے) لگادیئے گئے۔ یوں یہ ایک بہت اعلیٰ اِختیاراتی بورڈ بنا۔ جو ہر قسم کے اخراجات کرنے کی منظوری دے سکتا تھا لیکن اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے کارڈ، لفافے کی قیمت وفاقی کابینہ کی منظوری کے بغیر مُقرر کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ لہٰذا چار سال بعد جب اگلی وزیرِاعظم مُحترمہ بے نظیر بھٹو کے